عصمت چغتائی کی آپ بیتی میں تانیثیتی عناصر

ڈاکٹر فرزانہ کوکب *

Abstract:

This research article deals with the autobiography of famous progressive writers Ismat Chughtai, "Kaghazi hay parahan". It is a misunderstanding that feminist point of view has been introduced by "Literary Theory" of late sixties. Progressive writers like Dr. Rashid Jahan, Ismat Chughtai, Khadija Mastoor and other presented the women self in their writings. This paper studies this autobiography in the context of modern feministic movement.

اپنی کہانی سنانا اور دوسروں کی کہانی سننا انسانی جبلت ہے۔ انسان میں یہ خوبی روز ازل سے ہے۔ جب تحریر کا فن ایجاد ہوا تو اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے تحریر کو وسیلہ بنایا گیا۔ دوسروں کے حالات اور اپنے کارناموں کو محفوظ کرنے کی خواہش آہستہ آہستہ رواج پاتی گئی۔ چونکہ یہ امر دوسروں کے لئے سودمند تھا۔ اس لئے اس کی اہمیت اور ضرورت ہر قوم نے محسوس کی۔

انگریزی میں رومانوی تحریک نے مصنف کو اہمیت دی اور مصنف کے بارے میں تجسس پیدا ہوا۔ اسے غیر معمولی اور پراسرار شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ عملِ تخلیق کی پراسراریت کے ساتھ ساتھ شاعر کی زندگی کرنے کے رویہ کو بھی غیر معمولی خیال کیا جاتا تھا۔

اٹھارہویں صدی میں خودنوشت سوانح حیات کے اقدار کا احساس وارداتِ قلبی اور تفکر تاریخ کے اثر سے پھیلا۔ کولرج کی بائیوگرافیا لٹریریا اس دور کی لازوال آپ بیتی ہے۔ اور تنقید کا اہم شاہکار بھی۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

انیسویں صدی میں مطالعاتِ انسانی کی تجدید سے آپ بیتی میں سائنٹفک انداز کی دلچسپی نے خصوصی حیثیت اختیار کر لی۔ سینٹ آگسٹائن کے confessions اور روسو کے اعترافات کو بھی خودنوشت سوانح حیات میں اہم مقام حاصل ہے۔

اُردو میں تخلیقی خودنوشت سوانح عمری کی مستقل روایت کا آغاز انیسویں صدی کے آخری عشروں کا واقعہ ہے اور یہ بلاشبہ انگریزی ادب سے اکتساب کے عمل کا نتیجہ تھا۔ قبل ازیں اس کی تخلیق ضمنی و متعلقہ اصناف میں ملتی ہے۔ اُردو میں آپ بیتی کے اظہار کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ جن میں تذکرے، روزنامچہ، خطوط، سفرنامہ رپورتاژ اور متفرق تحریر میں شامل ہیں۔

ان اصناف اور تخلیقی و تصنیفی نوعیّتوں سے قطع نظر اردو میں اب تک باقاعدہ خودنوشت سوانح عمری کے ضمن میں عبدالغفور نساخ اور جعفر تھانسیری کی تصنیف کردہ خودنوشتیں اردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریاں بتائی جاتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تازہ تحقیق کے مطابق پتمبیر سنگھ کی تحریر کردہ خودنوشت کو اردو کی اولین خود نوشت کہنا چاہیے۔(۱)

مذکورہ بالا تصانیف مردوں کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اُردو میں خواتین نے اس صنف کو کب اختیار کیا۔ اب تک غالب گمان یہی تھا کہ جدید دور میں ہی خواتین نے اس صنف یعنی آپ بیتی کی طرف توجہ کی مگر معین الدین عقیل اردو کی پہلی نسائی خودنوشت ''بیتی کہانی'' مصنفہ شہر بانو کو قرار دیتے ہیں:

> ''اسی طرح ایک اور خودنوشت سوانح عمری اب منظرِ عام پر نہ آنے کے باعث کسی کی توجہ حاصل نہ کر سکی۔ اسے شہر بانو نے ''بیتی کہانی'' کے عنوان سے مئی ۱۸۸۵ء میں تصنیف کیا تھا اور قریب ڈیڑھ سال بعد اس میں محض دیباچے کا اضافہ کر کے اسے کتابی شکل دی۔ اس لحاظ سے نساخ اور جعفر تھانسیری کی مذکورہ تصانیف سے قبل تخلیق میں آنے والی اور اولین نسوانی خودنوشت سوانح عمری کہنا چاہیے۔''(۲)

''بیتی کہانی'' کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر عقیل لکھتے ہیں:

> ''اس تصنیف کی اہمیت صرف اسی قدر نہیں کہ یہ اردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریوں میں سے ایک ہے۔ اس عہد میں کہ ہندوستانی خواتین میں حصولِ علم اور تصنیف و تالیف کا ذوق ابھی عام نہیں ہو سکا تھا۔ اور اپنے ابتدائی تشکیلی مرحلے میں تھا۔ کسی خاتون کا

تصنیف پر آمادہ ہونا اور پھر اس صنفِ ادب کو اختیار کرنا جو اس وقت عام تھی۔ ایک قابلِ توجہ امر ہے۔''(۳)

اور بلاشبہ اُردو میں آپ بیتی کی صنف کو برتنے والی خواتین ادیبوں کی فہرست کوئی بہت طویل نہیں۔ اس حوالے سے (کارِ جہاں دراز ہے) قرۃ العین حیدر، (کاغذی پیرہن) عصمت چغتائی، (ہمسفر) حمیدہ اختر حسین رائے پوری، (میرا بچپن) عذرا عباس، (بری عورت کی کتھا) کشور ناہید اور (جو رہی سو بے خبر رہی) ادا جعفری جیسے نام منظر عام پر آئے ہیں۔

درحقیقت اس عہد کی مسلمان عورت کا تصور کیا جائے تو گھر کی چار دیواری میں بند علم و عقل سے بے پردہ زندگی کے مسائل سے بے خبر اور محض بچے جننے والی ایک مشین کا ہیولہ ابھرتا ہے۔ حالانکہ اس وقت آزادئ نسواں کی تحریک پورے ایشیاء میں زور پکڑ چکی تھی۔ اس سے پہلے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سرسید تحریک کے زیرِ اثر تعلیم نسواں کا نعرہ ادب میں لگایا گیا۔ اسی طرح ترکی کی نامور ادیبہ خالدہ ادیب خانم اور ہندوستان کی مسز سروجنی نائیڈو اس صنف میں بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکی تھیں لیکن ہندوستان کے مسلم معاشرے کا برا حال تھا۔ لوگ اپنی بچیوں کو مدرسوں میں بھیجنے پر آمادہ نہ تھے۔ پردے کی پابندیاں اپنی جائز حدود سے کہیں آگے تھیں۔

عورتوں کے حقوق یا فیمنیزم کی جدوجہد میں ایک بہت اہم کردار ترقی پسند کمیونسٹ تحریک نے ادا کیا۔ ہیگل اور لینن نے عورت کی محکومی کے بارے میں ایک جامع تحقیق پیش کی کہ کس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے عورتوں کی آزادی کو غلامی میں تبدیل کر دیا۔ لینن کی origion of family & state نے عورتوں کا شعور اجاگر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

فیمنیزم کی تعریف عام طور پر اس طرح کی جاتی ہے کہ فیمنیزم اس احساس کا کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے اور اِس صورتحال کو بدلنے کی شعوری کوشش کا نام ہے۔

فیمینیزم کو ایک آئیڈیالوجی اور سماجی تحریک مان کر یہ بھی کہا گیا ہے:

"Feminism, like other ideological and social movements, has a contingent nature. It takes different forms when articulated with different social, economic and cultural systems and levels of development." (۴)

اسی طرح قاضی افضال حسین کے مطابق:

''عورت بیان کی گرفت میں آسکنے والی وحدت ہے ہی نہیں۔ تانیثیت کے بعض بے حد اہم نظریہ سازوں کے نزدیک عورت کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا یا اس کے صفات و امتیازات کو متعین کرنا تقریباً ناممکن ہے۔''(۵)

بہرحال پچھلی صدی کے اواخر میں اردو ادب میں تانیثیت کے مباحث اہم گردانے گئے اور تانیثیت کو باقاعدہ ایک تحریک کے طور پر برتا گیا لیکن جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اس سے قبل ترقی پسند تحریک نے عورت کے حوالے سے شعورِ ذات کا احساس دلایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رشید جہاں کا نام اس لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے انگارے کی اشاعت کے ذریعے مردوں کی دنیا میں عورت کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ ان کے بعد عصمت چغتائی کا نام ان کے مقلدین میں سب سے اہم ہے۔ عصمت چغتائی ڈاکٹر رشید جہاں سے بے حد متاثر تھیں اور بقول ہاجرہ مسرور:

''اب ایسے عالم میں انگارے والے ہنگامے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی عصمت چغتائی یوں آئیں جیسے جوالہ مکھی پھٹ گیا ہے۔''(۶)

بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

''عصمت چغتائی سے پہلے تخیل کی حکمرانی تھی اور عصمت کے ساتھ برہنہ سچ کا دور شروع ہوا۔''(۷)

ایک ایسے زمانے میں جب شاعرات اور خواتین افسانہ نگار عورت کے جذبات اور ان کی نفسیات کے بیان میں مردانہ عینک استعمال کرتی تھیں اور انہی کی طرح لکھتی تھیں۔ عصمت چغتائی نے سب سے پہلے خاتون ادیبوں کو عورت پن کو محسوس کرنا اور اس کے احساسات کو پوری دیانتداری کے ساتھ قلم بند کرنا سکھایا۔ یہ وہ دور تھا جب عورتوں کے جذبات اور ان کی حسرتوں اور محرومیوں کے اظہار کا فریضہ مرد ادیبوں نے سنبھال رکھا تھا لیکن عصمت چغتائی نے ان سے یہ اجارہ داری واپس لے لی اور عورت کی زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں کو ہمدردی کے ساتھ لیکن بیدردی کے پیرائے میں بے نقاب کیا۔

عصمت چغتائی کے ہاں عورت ان کے فن کا محور و مرکز ہے۔ ان کے ہاں عورت کا اغلب روپ اس کی زبردست فعالیت ہے۔ عورت کی مظلومیت کے خلاف عصمت چغتائی کے یہاں جو احتجاج جھلکتا ہے اسے ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اردو ادب میں نسوانی تحریک کا نقطۂ آغاز کہا ہے۔(۸)

عصمت چغتائی عورت کی مظلومیت اور خودمختاری کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر اس طرح بیان کرتی ہیں:

''مغربی عورت یا مشرقی عورت اگر وہ جوتے کھاتی ہے اور چوں نہیں کرتی تو اس کے وجود پر رحم نہیں غصہ آتا ہے۔عورت کو نسوانیت کا پوٹلا بیچ چوراہے میں پٹختا ہوگا۔نسوانیت سے میرا مطلب ہے دنیا کا خوف، بدنامی کا ڈر،طعنوں کی ہیبت، لاحول ولاقوۃ سب پھندے ہیں۔جو عورت خود مختار ہو وہ کسی طرح مرد سے کم نہیں رہتی۔''(۹)

لحاف کی ''بیگم جان''، تل کی ''رانی''، دو ہاتھوں کی ''گوری''، پیشہ کی ''سیٹھانی''، کافر کی ''میں''، چڑی کی دُکی کی عالمہ، ننھی کی نانی کی ''نانی''، جڑیں کی ''اماں''، ڈائن کی ''اماں جان''، اسی طرح معصومہ کی ''معصومہ'' اور ٹیڑھی لکیر کی شمن جیسے غیر روایتی کردار جو استحصال پر مبنی معاشرے کے منہ پر طمانچہ مارنے والے کردار بھی ہیں۔اُردو ادب کو عطا کرنے والی لکھاری جب خود اپنی آپ بیتی لکھتی ہے تو ظاہر ہے وہاں قاری ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ اپنی آپ بیتی میں اسے وہ عصمت چغتائی ملے گی جو اپنے حوالے سے بھی ہر طرح کا اور پورا سچ بولنے اور دیانتداری برتنے کا ظرف اور ہمت رکھتی ہے۔جو زندگی کو تانیثیتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بصیرت سے پوری طرح بہرہ مند ہے اور معاشرے سے عورت کو بحیثیت فرد منوانے کے لئے معاشرے کی روایتی،خود ساختہ اور بوسیدہ اقدار سے ٹکر لینے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنی آپ بیتی ''کاغذی ہے پیرہن'' کے عنوان سے تحریر کی جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ آپ بیتی کے تقریباً آغاز میں ہی عصمت لکھتی ہیں کہ بڈھے بڈھیاں جو شادی میں بلائی گئی تھیں۔جو بات بات پر طعنے دیتیں دوپٹہ سر پر ڈھکنے کو کہتیں ''اے ہے شریف بیٹیاں یوں اکڑ کر مردوں کی طرح نہیں بیٹھتیں''، تو آگ لگ جاتی تھی۔ان کی جلی کٹی باتیں سن کر بڑی بہنیں تو طرچے دے جاتیں۔چپکے چپکے بڑبڑاتیں لیکن عصمت اپنی منہ زوری کے باعث تڑ تڑ جواب دینے لگتیں۔(ص ۱۵)

پردہ، دوپٹہ اور برقعہ کی پابندیوں سے عصمت کو ہمیشہ سے چڑ تھی۔عصمت کے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی ان دنوں ''قرآن و پردہ''، ''حدیث و پردہ'' لکھ کر کافی ہنگامے کھڑے کر چکے تھے۔پردے کی مخالفت اور موافقت میں زور و شور سے بحثیں چل رہی تھیں۔ایسے میں عصمت جو عظیم بھائی کے خیالات اور نظریات سے بے حد متاثر تھیں جب انہیں اپنے بھائی کی بارات میں برقع اوڑھ کر ٹرین کا سفر کرنے پر مجبور کیا گیا تو ان کے لئے یہ ناقابلِ برداشت تھا اور ان کے اندر انتہائی ذلت کا احساس پیدا کر رہا تھا۔حتیٰ کہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ ریل کی پٹڑی پر کٹ جائیں۔(کاغذی پیرہن،ص ۱۶)

عصمت نے عظیم بیگ چغتائی کے سمجھانے پر اپنے برقعہ کا اوپر والا حصہ بستر بند میں چھپا دیا۔جس کے

باعث انہیں چادر اوڑھا کر اتارا گیا۔ لیکن بہت مار بھی سہنا پڑی۔ اور گالیاں سننی پڑیں۔ (ص ۱۹-۲۰)

لیکن عصمت کو فتح کی سرشاری اور پردہ کی بے جا پابندی سے آزادی کی اتنی خوشی تھی کہ اس مار اور گالیوں نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ عصمت اس حوالے سے اپنی آپ بیتی میں اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

''فتح کا نشہ جس نے چکھا ہے وہی لمحے جی سکتا ہے جو میں اس دن پلیٹ فارم پر کھلے منہ جی رہی تھی۔'' (کاغذی پیرہن، ص ۲۰)

عصمت چغتائی بچپن ہی سے اپنے اوپر لگائی جانے والی کس بھی پابندی اور اپنے ساتھ صنفی امتیاز روا رکھنے پر سراپا احتجاج رہیں اور اسے انہوں نے محض زبانی احتجاج تک ہی نہ رہنے دیا بلکہ بطور فرد اپنا آپ منوانے، اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے، خود پر لگائی جانے والی کسی بھی بے جا پابندی اور اپنے ساتھ برتے جانے والے کسی بھی نوعیت کے صنفی امتیاز کے خلاف ہمیشہ عملی احتجاج اور جدوجہد بھی کی اور بارہا اس میں عصمت کو کامیابی نصیب ہوئی۔

بھائیوں کی برابری میں گھڑ سواری سیکھنے کا معاملہ ہو یا والدین سے ٹکر لے کر علی گڑھ اسکول میں داخلہ لینے کا مرحلہ ہو۔ یا پھر تعلیم ادھوری چھوڑ کر شادی کرنے کے خلاف ہر طرح کا زبانی اور عملی احتجاج ہو۔ عصمت نے ہمیشہ اپنے حق کی جنگ اپنے بل بوتے پر لڑی۔

عصمت اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''کبھی موقع ملا تو بتاؤں گی کہ میں نے کیسے کیسے دنگل لڑے ہیں اور آج جب میں نے بی۔اے کر لیا ہے تو خاندان میں میری مثالیں دی جاتی ہیں جیسے میں نے بڑا تیر مارا ہے۔ اب تو میری اماں کو بھی میرے وجود سے شرم نہیں آتی۔'' (ص ۵۰)

عصمت نے صرف خود کو تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لئے ہی خاندان سے ٹکر نہیں لی بلکہ جب وہ عملی زندگی میں آئیں تو انہوں نے گرلز سکول کی ہیڈ مسٹریس کی حیثیت سے تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لئے بھی ہر ممکن جدوجہد کی اور اس عہدہ سے پوری ذمہ داری سے وابستہ رہیں۔ عصمت نے اپنی آپ بیتی میں خود سے کئے جانے والے ایک سوال کے جواب میں اس طرح تحریر کیا ہے:

''میں شہر کے اکلوتے مسلم گرلز سکول کی ہیڈ مسٹریس ہوں۔ میرے چال چلن، رکھ رکھاؤ پر کتنی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ میں نیم پاگل ہو سکتی ہوں۔ مگر غیر ذمہ داری سے مجھے گھن آتی ہے۔ میں جانتی ہوں مسلم اسکول کن مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں

پر قوم کی نظر کس امید پر پڑتی ہے کہ یہ ایک ٹیڑھا قدم اٹھائے تو پیروں تلے سے فرش کھینچ لو۔ میں قوم کی خصلت چٹکی بجانے میں نہ بدل سکتی ہوں نہ امید کرتی ہوں۔'' (ص ۲۱۳)

عورت کے استحصال اور اس استحصال کے مقابلے میں عورت کی بے چارگی اور بے بسی کا احساس بالخصوص ہندوستانی معاشرہ میں بچپن ہی سے عصمت کے شعور کا حصہ بن گیا تھا۔ معاشرہ میں پائے جانے والی صنفی امتیازات، مرد کے جبر و اختیار کے ناحق استعمال کے نتیجہ میں عورت کی مظلومیت اور بحیثیت فرد اس کے حقوق سے معاشرہ کا برتا جانے الا اغماض ہمیشہ سے ان کو ایک کرب اور اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

جس کا اظہار عصمت اپنی خودنوشت میں کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی، مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت۔ دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں گلیوں میں کبڈی، کھیل کود اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔'' (ص ۲۴۸)

بلاشبہ ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کے حوالے سے صنفی امتیازات اور حقوق میں عدم مساوات کا آغاز ان کی اوائل عمری سے ہی ہو جاتا ہے۔ اور جس کا مسلسل نشانہ اور شکار بنتے بنتے عورت آخر اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر وہ اس استحصال اور ظلم سے نجات پا سکتی ہے۔

عصمت نے تمام زندگی معاشرہ سے عورت کو بحیثیت فرد بلکہ بحیثیت انسان اس کی ذات اور اس کے حقوق کو تسلیم کروانے کی کوشش کی اور اس استحصال کے حوالے سے وہ ہر پہلو کو سامنے لے کر آتی ہیں۔ چاہے ''لحاف'' جیسا افسانہ لکھ کر اور اس کے نتیجہ میں مقدمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس طرح اپنے فن کے ذریعہ ذاتی زندگی میں قدم قدم پر انہیں بحیثیت عورت اپنے حقوق کو تسلیم کروانے اور ان کے حصول کے لئے اپنے گھر والوں اور عزیز رشتہ داروں سے ٹکر لینی پڑی یا پھر ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھانی پڑی اور پھر عورت کو بھی اپنے فن کے ذریعہ قدم قدم پر یہ احساس دلایا کہ وہ اس کی حیثیت کو جب تک وہ خود تسلیم نہیں کر لے گی۔ وہ خود اپنے حقوق کا ادراک نہیں کرے گی جب تک عورت خود اس معاشرتی جبر و استحصال کے سامنے سینہ سپر نہیں ہو گی۔ تب تک معاشرہ اسے ایک فرد کی حیثیت سے اس کا وجود تسلیم کرنے سے انکاری رہے گا۔

اپنی آپ بیتی میں اس کا اظہار عصمت اس طرح کرتی ہیں:

''مجھے روتی بسورتی، بچے جنتی، ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی نفرت اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔'' (ص ۲۸۹)

عصمت کی ذاتی زندگی اور فنی زندگی عورت کو اس کا مقام دلانے خود اس کو اس کی حیثیت کا ادراک کرنے کی طرف راغب کرنے اور معاشرہ کی جانب سے عورت کے سر زبردستی منڈھے گئے ستی ساوتری کے غیر فعالی روپ کو اتار پھینکنے کے لئے کی گئی جدوجہد کی ایک حقیقی داستان ہے۔ جو عصمت چغتائی جیسی ایک خود شناس، خود آگاہ، بہادر اور اعلیٰ تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی شعور سے بہرہ ور عورت ہی کی ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ عبدالغفور نساخ (۱) اور جعفر تھانسیری (۲) کی تصنیف کی کردہ اُردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریاں بتائی جاتی ہیں جو ۱۸۸۶ء میں لکھی گئیں جب کہ پیتمبر سنگھ (۳) اور سید رجب علی (۴) کی خودنوشت تا حال اس موضوع پر کام کرنے والے تحقیقی اور مورخین ادب کے پیش نظر نہ آسکیں، اس اعتبار سے پیتمبر سنگھ کی تحریر کردہ خودنوشت کو اُردو کی اولین خودنوشت کہنا چاہیے۔
ڈاکٹر معین الدین عقیل، بیتی کہانی، (مرتبہ) ادارۂ علمی، حیدرآباد، پاکستان، ص ۸

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

4. Haideh Moghissi, Feminism Islamic Fundamentalism: The Limit of Postmodern Analysis, University Press, Great Clarendon Street, Oxford, 1999, P-32

۵۔ قاضی افضال حسین، مابعد جدیدیت-نظری مباحث، مرتبہ: ناصر عباس نیئر، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۱

۶۔ ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی ایک تاثر، عصمت چغتائی اور فن، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد: ورڈ ویژن پبلشرز بلیوایریا، ۱۹۹۲ء، ص ۳۱۲

۷۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، عصمت، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، عصمت چغتائی شخصیت اور فن، ص ۳۱۲

۸۔ ''عصمت چغتائی نسوانی تحریک کی پیش رو''، از ڈاکٹر فہیم اعظمی، ''عصمت چغتائی: شخصیت اور فن''، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ص ۲۱۲

۹۔ ''میں اور میرا فن''، از عصمت چغتائی، ''عصمت چغتائی: شخصیت اور فن''، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ص ۲۰۱